ممتاز حسن (مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان)

مولانا سیّد محمد مرتضیٰ ادیب رحمۃ اللہ علیہ

عربی کی کلاس تھی، اور کالج کا آخری دن۔ ہم حسب معمول بڑے ہال کی چھوٹی ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے۔ اگلے روز گرمی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ سبق ختم ہوا تو مولانا نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور فی امان اللہ کہا اور جیسا ان کا قاعدہ تھا اپنے لیے دعا کے طالب ہوئے: "دیکھو بھئی کل وطن جا رہا ہوں دعا میں یاد رکھنا۔" پھر دل میں کچھ خیال آیا تو ٹھہر گئے۔ "اور ہاں یہ تو کہو کہ تم لوگوں کے لیے کیا لاؤں؟" یہ بی۔ اے کی کلاس تھی اور ہم لوگ خاصے معتبر قسم کے آدمی سمجھے جاتے تھے، مگر مولانا کا یہ کہنا تھا کہ بچوں کی سی فرمائشیں شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب جو گانے کے رسیا تھے فوراً بول اٹھے "قبلہ وہ آپ کا ہم وطن ہے نا محمد حسین نگینہ والا اس کا کوئی اچھا سا ریکارڈ مل جائے تو میرے لیے لے آئیں۔" ایک اور صاحب بولے "سنا ہے کہ نگینے میں مٹی کی صراحیاں خوب بنتی ہیں، ہو سکے تو میرے لیے ایک صراحی لیتے آئیں۔ مولانا نے فرمایا "بہت خوب۔" ہم پانچ چھ آدمی تھے، ہر ایک نے باری باری اپنی فرمائش بیان کی ایک میں باقی رہ گیا۔ مولانا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "میرے ساتھیوں نے فرمائشوں کی فہرست تو ختم کر دی، اب میں کیا کہوں، میرے لیے آپ جو مناسب سمجھیں، لیتے آئیں۔" مسکرا کر کہا "اچھا"۔ کلاس ختم ہو گئی۔ مولانا گھر تشریف لے گئے اور ہم لوگ بھی حسب معمول اپنی اپنی اقامت گاہوں کو واپس ہوئے۔

تین مہینے گذر گئے، کالج کھل گیا اور پڑھائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہم لوگ عربی کی

کلاس میں پہنچے تو دیکھا کہ مولانا کی کرسی کے پاس کچھ چیزیں رکھی ہیں۔ میں نے دل میں کہا "ہو نہ ہو یہ ہم لوگوں کی فرمائشیں ہیں۔" اور تھا بھی یہی۔ ابھی ہم سلام کر کے بیٹھے بھی نہ تھے کہ مولانا نے ایک ایک سے کہنا شروع کیا کہ "لو بھئی، یہ تمھارے لیے ہے، تم نے محمد حسین کا ریکارڈ مانگا تھا نا۔" اور علیٰ ہذا القیاس ہر ایک کو اس کی فرمائش پہنچا دی۔ ہم سب حیران تھے کہ مولانا نے رخصت ہوتے وقت کوئی چیز کہیں نوٹ نہیں کی تھی، ذہن میں یہ ساری فرمائشیں اتنے عرصے تک جوں کی توں کیسے محفوظ رہیں؟ اور کیا معلوم اور کلاسوں نے بھی ہماری طرح فرمائشوں کی بھرمار کر رکھی ہو۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مولانا میری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے "بھئی آپ کے لیے بھی ایک چیز لایا ہوں۔" میں نے کہا "جو آپ کی خوشی۔" فرمایا۔ "نواب مرزا شوق کا نام تو سنا ہوگا۔" میں نے کہا "جی ہاں، ان کی دو مثنویاں بھی دیکھی ہیں، 'زہر عشق' اور 'بہار عشق'۔" فرمانے لگے "یہ مثنویاں آپ نے کیا دیکھی ہوں گی، پوری تو چھپی بھی نہیں ہیں۔ بہرحال میرے پاس ایک قلمی نسخہ بہار عشق کا عرصے سے پڑا تھا، خود نواب مرزا شوق کے زمانے کا ہے، میرے کام کا تو ہے نہیں، میں چاہتا ہوں تمھیں دے دوں۔ یہ لو یہ تمھارے لیے ہے۔" اور وہ قلمی نسخہ اٹھا کر مجھے دے دیا۔ میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ دل نے کہا: یہ تیرے کچھ نہ مانگنے کا صلہ ہے، دیکھ کیا چیز مل گئی۔

وہ نسخہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو نہ صرف اس واقعے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے بلکہ کالج کی ساری زندگی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ وہ بھی کیا دن تھے جب ہم اپنے مولانا سے عربی پڑھا کرتے تھے۔ کہنے کو تو وہ عربی تھی مگر دنیا کا کونسا علم اور کون سی دلچسپی تھی جو اس عربی کے دائرے میں داخل نہیں تھی۔ فارسی اور اردو کا تو ذکر ہی کیا۔ ادب، تاریخ اور فلسفے کا کون سا مسئلہ تھا، پرانا ہو کہ نیا جو زیر بحث نہیں آتا تھا۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہ ہمیشہ ہم ہی پوچھیں اور مولانا ہی بتائیں۔ انھیں جو چیز معلوم

نہیں ہوتی تھی وہ ہم سے پوچھ لیتے تھے سچ تو یہ ہے کہ ہمارے مولانا جتنے بڑے صاحب علم تھے اس سے بھی کہیں بڑھ کر طالب علم تھے۔ ان کی تعلیم پرانے طریقے پر ہوئی تھی۔ فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ جو علوم انھوں نے حاصل کیے تھے، ان میں ان کا علم بے پایاں تھا اور جو کچھ پڑھا تھا انھیں مستحضر تھا۔ مجھے فلسفے سے شوق تھا۔ مولانا، ارسطو اور افلاطون سے لے کر بوعلی سینا اور مُلّا صدرا، سب پر حاوی تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے پرانے فلسفے کے متعلق ان سے کوئی استفسار کیا ہو اور انھوں نے بحث کو انتہا تک نہ پہنچا دیا ہو۔ حادث و قدیم، وحدت و کثرت، ذات و صفات جیسے مسائل پر ان سے گفتگو کرنا اپنے علم میں اضافہ کرنا اور اپنے ذہن کو جلا دینا تھا۔ مجھے عدل اور ظلم کی وہ بحث اکثر یاد آتی ہے جس پر گھنٹوں صرف ہوئے۔ سب سے پہلے مولانا نے عدل کی لغوی تعریف کی، یعنی "وضع الشئ فی محلہ" پھر ظلم کی، یعنی "وضع الشئ فی غیر محلہ"۔ اس کے بعد انسانی زندگی اور انسانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا عدل اور ظلم کے نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینا جو شروع کیا تو یقین جانیے، حقائق اور بصائر کا ایک سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایسی بحثیں ہم لوگ ہی چھیڑا کرتے تھے، ورنہ مولانا کو اپنے علم و فضل کی نمائش مطلقاً منظور نہ تھی۔ البتہ ہماری علمی جستجو کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

انگریزی انھوں نے نہیں پڑھی تھی مگر چونکہ کالج میں عربی کے لیے ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا، مولانا ایک ایک لفظ کا ترجمہ ہمیں انگریزی میں بتاتے تھے۔ اس مقصد کی خاطر جانسن کی انگریزی عربی کی ڈکشنری بھی خرید رکھی تھی، جس کی قیمت اس زمانے میں ڈیڑھ دو سو روپے سے کیا کم ہوگی۔ اور یہی مولانا کی ماہانہ تنخواہ بھی تھی۔ اس ڈکشنری کی مدد سے ہر روز پوری طرح تیار ہو کر آتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی جاری تھی۔ عربی کی کلاس ختم ہوتی تو مجھ سے انگریزی میں مدد لیتے۔ انگریزی کمپوزیشن اکثر ہمارے پروفیسر سٹکلیر صاحب کو دکھاتے جو آج کل کالج کے پرنسپل ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں میٹرک پاس کیا۔ ایف۔اے کا امتحان

دینے والے تھے کہ موت نے آلیا اور یہ سرچشمۂ علم و ادب ہمیشہ کے لیے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ وطن نگینہ ضلع بجنور۔ والد کا نام حکیم سید علی نقی جو ایک نامی گرامی طبیب تھے، مراد آباد سے آکر نگینے میں آباد ہوئے۔ ان کے والد یعنی ہمارے مولانا کے دادا کا نام سید آل علی تھا۔ ان کی زندگی مراد آباد میں گزری اور وہیں فوت ہوئے۔

سید علی نقی کے تین صاحبزادے تھے۔ محمد نبی، محمد عسکری اور محمد مرتضیٰ یعنی ہمارے مولانا۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ بچپن میں نجی طور پر تعلیم پائی اور مختلف اساتذہ سے اسناد حاصل کیں۔ اپنے والد سے طب بھی پڑھی۔ بعد میں منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحان بھی پاس کیے۔ نگینے میں کچھ عرصے تک پڑھایا۔ کسی امتحان کے سلسلے میں الہ آباد گئے تھے کہ وہاں لاہور کے مشن کالج کے پروفیسر محمد اسمٰعیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ عربی اور فارسی کے فاضل تھے اور کالج میں ان ہی زبانوں کے پروفیسر اور شعبے کے صدر بھی تھے۔ انھوں نے ہمارے مولانا کو دیکھا تو ان کی قابلیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور انھیں آمادہ کر کے لاہور لے آئے۔ یہ ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے۔ اسی زمانے میں مولوی محمد باقر کالج سے پنشن پاکر عربی کی پروفیسری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ہمارے مولانا کا تقرر ہوا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اسمٰعیل صاحب نے امتحاناً ان سے عربی میں ایک مقالہ لکھنے کو بھی کہا تھا۔ مولانا نے جو مقالہ لکھا اس کا عنوان تھا "ان الدین عند اللہ الاسلام"۔ پروفیسر اسمٰعیل کی جوہر شناسی اور منصف مزاجی کی داد دینی چاہیے کہ اگرچہ وہ خود عیسائی تھے اور مولانا کے مقالے کا موضوع خالص اسلامی تھا، انھوں نے ان کی غیر معمولی قابلیت کو دیکھتے ہوئے بلا تامل انھیں کالج کے لیے منتخب کر لیا۔

مولانا مذہباً اثنا عشری تھے۔ دینی معاملات سے انھیں خاص دلچسپی تھی اور یہاں بھی ان کا پایۂ علم بہت بلند تھا۔ انھیں سید الشہداء سے بے پناہ عقیدت تھی۔ کربلا کا واقعہ اکثر

بیان کرتے تھے۔ ان کا انداز بیان جذباتی کم اور علمی زیادہ ہوتا تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کا اثر گہرا اور پائدار بھی تھا۔ ہماری عربی کی کلاس میں بھی جب کبھی وقت ملتا تو ہم لوگ ان سے دین اور مذہب کے معاملات پر سوال کیا کرتے تھے۔ یہ بظاہر بڑا نازک مسئلہ تھا۔ خود میں تو جیسا کہہ چکا ہوں فلسفے کا طالب علم تھا اور ایک حد تک لامذہب، مگر میرے ہم جماعت سب کے سب سُنّی اور حنفی تھے اور ایک دو تو خدا خوش رکھے سرحد کے پٹھان تھے اور خالی قسم کے اہل السنت والجماعت۔ یہ سب لوگ مولانا سے خاص طور پر ان مسائل پر سوال جواب کیا کرتے تھے جو سنی شیعہ میں صدیوں سے متنازعہ فیہ چلے آتے ہیں۔ میں ان بحثوں کو دلچسپی سے سنتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں خدانخواستہ کسی بات پر بدمزگی پیدا نہ ہو جائے۔ مگر کیا کہنا حضرت مولانا کا، خدا انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے، ہر سوال کا جواب بلا تامل دیتے اور تفصیل سے دیتے، مگر ایسی خوبصورتی سے اور ایسے معقول انداز میں کہ کیا مجال کسی کی دل آزاری کا کوئی بھی پہلو اس میں نکل سکے۔ ان سے بات کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اور وہ جتنی بے تکلفی سے بات کرتے ہیں اتنا ہی ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگوں کے ذاتی یا آبائی عقائد کچھ بھی ہوں، مولانا کی صحبت پانے کے بعد کسی قسم کے فرقہ وارانہ تعصب کی جگہ دل میں نہ رہی۔ مسلمان تو الگ رہے، غیر مسلم بھی ہمیں انسان معلوم ہونے لگے۔ آج مسلمانوں کے آپس کے جھگڑے دیکھتا ہوں اور ان کے باہمی عناد اور فساد کی خبریں سنتا ہوں تو اپنے استاد کو یاد کرتا ہوں۔ کیا ہو گئے وہ لوگ جن سے ملنا، جن کے پاس بیٹھنا، انسانیت کا سبق سیکھنا تھا۔ جن کے دل میں اسلام، مسلمانوں اور نوعِ انسانی کی محبت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کے سامنے عقائد کے اختلاف اور مذہبی مسائل کی پیچیدگیاں بے حقیقت ہو کر رہ گئی تھیں:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہم مولانا سے عربی کے علاوہ اردو بھی پڑھتے تھے اور میں تو انھیں اپنا کلام بھی بغرض اصلاح دکھایا کرتا تھا۔ شاعری میں میں نے صرف دو استادوں سے اصلاح لی ہے، ایک حضرت مولوی عبدالکریم مرحوم و مغفور سے جو ایک زمانے میں جہلم کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں عربی کے استاد تھے۔ دوسرے مولانا سید محمد مرتضٰے رحمۃ اللہ علیہ سے۔ میرے یہ دونوں استاد خود بھی شعر کہتے تھے۔ مولوی عبدالکریم فارسی میں اور مولانا سید مرتضٰی اردو میں۔ ان بزرگوں کے لیے شاعری نہ ذریعۂ عزت تھی نہ وسیلۂ معاش، محض ان کے گوناگوں کمالات کا ایک پہلو تھی۔ حضرت مولانا سید مرتضٰی کا کلام زیادہ نہیں، پرانی طرز کے کہنے والے تھے، کبھی کبھار کہتے تھے۔ ادیب تخلص تھا۔ قصیدہ، غزل، نظم، رباعی سب پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ افسوس ہے کلام بیشتر ضائع ہوگیا۔ مجھے ان کا ایک قصیدہ ۱۹۲۳ء کا ملا ہے جو انھوں نے کالج کے مشہور ہوسٹل یونگ ہال کی ایک الوداعی تقریب کے موقعے پر کہا تھا:

مفلس ہوں پہ حاکم ہوں اقلیم سخن کا میں — نادار ہوں ظاہر میں پر طبع ہے سلطانی
شمشیر صفت ہوں میں معمور جواہر سے — کیوں ہنستی ہے تو مجھ پر اے بے سروسامانی
کالج کی کشش لائی پنجاب میں جب مجھ کو — لاہور کو تب دیکھا جو شہر ہے لاثانی
کالج کے پروفیسر یکتائے زمانہ ہیں — ہو آرٹ کہ یا سائنس ہے ان کے لیے پانی
شانوں پہ اگر گاؤن ڈپلومے ہیں ہاتھوں میں — دعویٰ ہے ارسطو بھی ہے طفل دبستانی

میں اس موقعے پر موجود نہ تھا لیکن جب مولانا کا قصیدہ کالج میگزین میں شائع ہوا تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "حضرت مجھے آخری شعر میں کلام ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں شاعر نے معمول سے زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے۔" پھر خدا مجھے معاف کرے ذرا گستاخ سا ہو کر کہا "قبلہ آپ تو خود جانتے ہیں کہ ارسطو اور افلاطون کس پائے کے عالم و فلسفی تھے، پھر آپ کا یہ دعویٰ کہ ہمارے پروفیسروں کے سامنے ارسطو طفل دبستاں کی حیثیت رکھتا ہے، کہاں تک صحیح ہے؟" مولانا ہنس پڑے، کہنے لگے "میاں یہ تم سے کس نے کہا کہ یہ

دعویٰ میرا ہے، ہوگا تو انھی لوگوں کا ہوگا یا کوئی اور لوگ کہتے ہوں گے۔ مصرعے کو دیکھو میں نے خود تو یہ سند ان کو نہیں دی۔" اس پر کلاس میں ایک قہقہہ پڑا اور مولانا بھی ہمارے ساتھ دیر تک ہنستے رہے۔ اگلے سال انھوں نے ایک بہاریہ قصیدہ کہا، اس کے چند شعر ہیں:

قوت نشو کا ہے عنصر خاکی میں یہ جوش — شاخ نارستہ ہے ہر تخم کے اندر بے کل
باغباں پھرتے ہیں پھولے ہوئے گلشن گلشن — موسم گل نے کھلایا ہے ہر اک دل کا کنول
سبزہ اگتا ہے کہیں، پھول کہیں کھلتے ہیں — قلب میں عنصر خاکی کے پڑی ہے ہل چل
پھول میں پھول ہے غنچے سے ہے پیدا غنچہ — شاخ میں شاخ ہے، ہر شاخ میں پھوٹی کونپل
ابر بالائے فلک آ کے برس جاتا ہے — صحبت بلبل و گل میں نہ پڑے تا کہ خلل!

اس قصیدے میں یونگ ہال پر بھی کچھ شعر ہیں۔ اس زمانے میں یہ ہوسٹل برصغیر کے شمالی حصے میں سب سے زیادہ شاندار مانا جاتا تھا۔ دیکھیے انھوں نے کیسا نقشہ کھینچا ہے:

قصر جمشید میں یہ زینت و رونق ہے کہاں — اس سے تشبیہ اسے دوں؟ ٹوٹا ہو محل؟
مرد استادہ ادب سے ہیں یہاں اور وہاں — جبہ سائی پہ ہے مامور ہمیشہ صندل
نزہت تازہ نہ کیوں اس کے چمن کو ہو نصیب — بحر اخضر سے صدا آتے ہیں اٹھ کر بادل
باغ کے وسط میں اس طرح عمارت ہے عیاں — ہو شگفتہ کسی تالاب میں جس طرح کنول
وہ بلندی ہے عمارت کی کہ افلاک ہیں خم — بام پر کوئی کھڑا ہو تو چھوئے جا کے زحل

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ یہ شکوہ الفاظ، یہ شوکت بیان، یہ تخیل کی بلندی، یہ مضمون کی تازگی، کسی معمولی شاعر کے بس کی بات ہے؟ اردو کے قدیم اساتذہ میں اس کا جواب ہو تو ہو ہمارے زمانے میں تو اس پائے کی شاعری کمیاب کیا نایاب ہے۔ اس کے باوجود جب یہ قادر الکلام سخن در مقطع لکھنے بیٹھا تو دیکھیے اپنے قصیدے کو کس انکساری سے محض ایک نظم سے تعبیر کیا:

پاس احباب سے یہ نظم لکھی میں نے ادیب — جانتا ہوں نہ قصیدہ نہ رباعی نہ غزل

منکسر المزاجی ہمارے مولانا کی سیرت میں بڑی نمایاں تھی۔ ان کو دیکھ کر بے ساختہ صائب کا وہ شعر یاد آتا تھا کہ:

فروتنی است نشان رسیدگان کمال — کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں مگر میں نے میگزین کے پرچوں کی جتنی ورق گردانی کی ایک آدھ سے زیادہ غزل مولانا کی ہاتھ نہیں آئی۔ ایک آدھ شعر سنیے:

سحر غضب کا ہے بھرا دیدۂ عشوہ ساز میں — بیٹھے ہیں لاکھوں معتکف تیرے حریم ناز میں

جل گئے سوز عشق سے لب پہ نہ آئی آہ تک — دیکھیں ہماری کاوشیں قدرت ضبط راز میں

پوچھو تو یہ کلیم سے اس پہ ہی شوق دید تھا — ہو گئے وقف بے خودی آتے ہی بزم ناز میں

بہار پر دو شعر اور سن لیجیے:

اک شور ہے عالم میں پھر فصل بہار آئی — دکھلانے لگے ہر سو گل باغ میں رعنائی

پھر دیدۂ شبنم کو بخشی گئی بینائی! — پھر باغ پہ لہرا کر کالی سی گھٹا چھائی

رباعی بھی مجھے ایک کے سوا نہیں ملی۔ یہ مولانا نے کسی ڈنر کے موقعے پر کہی تھی:

چنے کھانے میزوں پہ ہیں چار سو — عیاں ہے کہ ہیں میزباں نیک خو

ہر اک سمت سے آ رہی ہے صدا — ھنیئاً مریئاً کلوا واشربوا

نثر میں بھی ان کے مضامین بہت کم ہاتھ لگے۔ میگزین میں جس کے حصۂ اردو کے وہ نگراں تھے، ان کے قلم سے مولانا حالی پر ایک مضمون کی چند قسطیں چھپی تھیں۔ افسوس ہے کہ موت نے تکمیل کی مہلت نہ دی۔ البتہ اس نا تمام مقالے سے بھی ان کے انداز تحریر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً حالی پر سید احمد خاں کا جو اثر ہوا اس کا تذکرہ مولانا نے اپنے مقالے میں یوں کیا ہے:

"مرشد ملا اور ایسا ملا جس نے راشد بنا دیا۔ وہ کون یعنی طبیب قوم، عیسیٰ زماں، سر سید احمد خاں، جس کی صحبت نے مولوی سے مولانا بنا دیا۔ دلی سے نکال کر دنیا میں مشہور کر دیا۔ سر سید کے احسانات جو قوم پر ہیں ان کو کون نہیں جانتا؟ قوم کے بچوں کے لیے دامن پھیلا پھیلا کر

بھیک مانگنا سرسید ہی کا کام تھا۔ اس محب قوم کی صحبت نے مولانا کے شعلۂ حب قومی کو جو ابھی تک دل میں اسی طرح پنہاں تھا جس طرح چقماق میں آگ، بھڑکا دیا۔ ایک دیوانۂ قوم نے دوسرے جاں فدائے ملک کا خیر مقدم کیا۔"

اسی مقالے میں لاہور میں اردو شاعری کے فروغ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لاہور سمت کے اعتبار سے ہندوستان کے شمال مغربی صوبے کا ایک شہر ہے، مگر شعر کے لحاظ سے ہندوستان کا مغرب ہے۔ یہاں اردو شاعری نے قدم رکھا تو یورپ کی شاعری سے رنگین ہو گئی۔ تقاضائے قدرت ہے کہ جو بچہ جس قوم میں پرورش پاتا ہے اسی کی زبان کو سیکھتا ہے ناممکن ہے کہ ایک بچہ جس نے عرب میں نشو و نما پائی ہو، فارسی زبان بولنے لگے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"جب مشرقی بلبلیں اڑ گئیں اور مغربی قمریوں نے رنگ جما لیا، تب یہاں اردو میں شعر و شاعری کا چرچا ہوا۔"

ایک اور مقام پر مسدس حالی کا مقابلہ اقبال کے 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' سے کیا ہے، فرماتے ہیں:

"مسدس کی وہ شہرت ہوئی جو خود مولانا ہی کی دیگر نظموں کو نہ ہوئی۔ دیگر شعرا نے بھی بعد کو اس قسم کی نظمیں لکھیں، مگر وہ مقبولیت کہاں۔ صرف ناقدان سخن نے ان کی قدر کی، زبان زد خلائق نہ ہوئیں۔ مثال کے طور پر میں ڈاکٹر محمد اقبال بالقابہ کی نظمیں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پیش کرتا ہوں۔ ان نظموں میں فاضل مصنف نے اپنی خداداد طبع موزوں کا جوہر دکھایا ہے۔ الفاظ شیریں، بندش چست، محاورہ بندی پیاری، خیالات جدید، مفہوم لذیذ، نظم کو پڑھو گویا بندوں کی باتیں خدا سے ہو رہی ہیں۔ با ایں ہمہ عام شہرت نہیں۔ صرف اس لیے کہ "الفضل للمتقدم"۔"

جب میں نے پہلے پہل مولانا کی یہ تحریر دیکھی تو مجھے ان کی رائے قبول کرنے میں تامل ہوا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا، صحیح کہا۔ آج "مسدس حالی" کے بند کے بند لوگوں کو ازبر ہیں مگر "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی یہ صورت نہیں۔ البتہ اقبال کی بعض دوسری نظمیں اور غزلیں مقبولیت میں خود مسدس سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔

مولانا سے میرا اصلاح سخن کا سلسلہ باقاعدہ نہ تھا، اور جس بے تکلفی کا رشتہ مجھ میں اور ان میں قائم تھا شاید اردو شاعری کی روایتی استادی اور شاگردی اس کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھی۔ یوں کہیے کہ میں تو ان کی خدمت میں اپنا کہا ہوا، ایک شاگرد کی حیثیت سے پیش کرتا تھا مگر وہ مجھے استادانہ اصلاح کی بجائے دوستانہ مشورہ دینا بہتر سمجھتے تھے ایک دفعہ میں نے بزعم خویش ایک بڑے زور کی غزل اردو میں کہی اور مولانا کی خدمت میں پیش کی۔ دوسرے دن مولانا نے مجھ سے کہا "غزل آپ کی میں نے دیکھی، کوشش آپ نے بے شک کی ہے، لیکن بھئی یہ تو کوئی بات نہیں بنی۔" پھر انھوں نے نہایت ہی مشفقانہ انداز میں موضوع اور انداز بیان کے اسقام کی نشاندہی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں ہی انھوں نے غزل واپس کی، میں نے اسے پھاڑ دیا۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا حرف حرف صحیح تھا۔ البتہ میری نظر ان خامیوں پر اس سے پہلے نہیں گئی تھی۔

ایک دفعہ میں نے فارسی کی ایک غزل کہی۔ مولانا نے اس کی تعریف کی لیکن کہنے لگے "بھئی ایک بات کہوں ذرا اس کا مطلع تو پھر پڑھنا۔" میں نے پڑھا:

فصل بہار آمد و گم گشتہ یار ما!
فریاد از درازیٔ شبہائے تار ما

کہنے لگے "دیکھیے شعر تو آپ نے اچھا کہا لیکن جو سنے گا وہ کیا کہے گا کہ آپ کے محبوب کس قدر منحوس تھے کہ ادھر فصل بہار کی آمد ہوئی اور ادھر یہ غائب ہو گئے، حالانکہ یہ عین وہ موقع تھا کہ انھیں آپ کے ہمراہ رہنا چاہیے تھا۔" مجھے ہنسی آ گئی، اس شعر کا یہ پہلو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ گم شدہ محبوب کے ساتھ ساتھ اس شعر کو بھی غزل میں

سے غائب کر دیا۔

اسی غزل کا ایک شعر تھا:

چوں شمع سوختیم و بدر دیدہ دوختیم از ما مپرس حال شب انتظار ما

مولانا نے پہلے مصرعے کو یوں بدل دیا:

چوں شمع سوختیم و سحر را نیافتیم

اور مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

شعر و شاعری کے سلسلے میں حضرت مولانا سے اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک دن قیامت نامہ و میزان اور جزا و سزا کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے شعر پڑھا:

اونچے اونچے مجرموں کی حشر میں ہو گی پکڑ کون پوچھے گا ہمیں ہم کن گنہ گاروں میں ہیں

مولانا کا قد ۶ فٹ سے اونچا تھا اور دبلے پتلے ہونے کی وجہ سے اور بھی بلند قامت نظر آتے تھے۔ شعر سنتے ہی میری گستاخی کو پا گئے اور ہنس پڑے۔ کہنے لگے "میاں جو شخص اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا چاہے کہ اسے وہاں کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا تو اس کا بھی کوئی علاج نہیں۔" یہ اس خاکسار کی طرف اشارہ تھا۔ اس پر ساری کلاس ہنس پڑی۔

ایک دن سادات کے خصائل اور فضائل کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مجھے مذاق سوجھا، عرض کیا "کہ حضرت وہ جو نذیر احمد نے فسانۂ مبتلا کے سرورق پر ایک شعر لکھا ہے، وہ آپ کی نگاہ میں کیسا ہے:

بہ ہر جا جمع می آید سادات فسادات، فسادات، فسادات

میرا خیال تھا کہ مولانا اس مذاق کو پسند نہیں کریں گے، اور واقعتاً تھی بھی محض گستاخی مگر وہ خفا ہونے کی بجائے ہنس پڑے، فرمایا کہ "یہ شعر تو معمولی ہے۔ سادات کی ہجو ہی مقصود ہو تو اورنگ زیب کا فقرہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ:

"تحفۂ مسجد ہستند نہ سوختنی نہ فروختنی"۔

اس کے بعد حضرت مولانا کی طبیعت میں شگفتگی کچھ اور بڑھی تو فرمانے لگے کہ "سادات کی قصیدہ خوانی کرنے والے تو بہت ہیں۔ ایک مسخرا تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ:

آدم از خاک سیّد از نور است　　آدمیّت ز سیّداں دُور است

غور کیجیے ایسا اور کون ہوگا جو خود اپنے نسب پر، اور نسب بھی وہ جس کے برابر کا اور کوئی نسب نہیں ہے، ہنسنے ہنسانے پر آمادہ ہو۔ میری گستاخی تو بلبلے کی طرح بیٹھ گئی اور دل میں مولانا کی جو عزت تھی وہ کچھ بڑھ ہی گئی، گھٹی نہیں۔

ایک دن میں نے وہ مشہور شعر پڑھا کہ:

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے　　زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

کہنے لگے "جانتے ہو اس کی اصلاح کیا کی ہے کسی نے؟" مجھے معلوم نہ تھا، فرمایا "لکھنؤ کے ایک شاعر کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا تو انھوں نے کہا کہ شعر تو برا نہیں، مگر یہ "چہارم آسماں" کیا بات ہوئی۔ مکان کی تعریف کرنا چاہتے تھے تو کم از کم اتنا تو کہتے کہ:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے　　زمیں آدھی تو آدھا آسماں ہے

مولانا کو جانوروں کے حالات سے بڑی دلچسپی تھی۔ کوئی ان سے کتنا ہی اوٹ پٹانگ سوال کیوں نہ کرے وہ بڑی سنجیدگی سے محققانہ جواب دیتے تھے۔ ایک دفعہ میرے ایک ہم جماعت نے پوچھا کہ "مولانا سانپ کے کان ہوتے ہیں یا نہیں؟" اس پر بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اسی طرح مکھی، مچھر، مکڑی، تنیتر، بٹیر، فاختہ، کبوتر کوئی جانور کوئی کیڑا مکوڑا کم ہی ایسا ہوگا کہ جس کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی سلسلے میں نہ آیا ہو۔ اس قسم کی بحثیں اکثر سبق کے خاتمے کے بعد ہوا کرتی تھیں۔

اردو کے معاملے میں ان کا مسلک بے نظیر تھا۔ وہ لفظ اور محاورے کی صحت کے سختی سے پابند تھے۔ مگر طبیعت میں سختی نام کو نہ تھی۔ بولتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے

پھول جھڑ رہے ہیں، یا موتیوں کی لڑی ہے جو پروئی جا رہی ہے۔ ایک دفعہ میرے منہ سے نکل گیا کہ فلاں شخص قریب المرگ ہے۔ کہنے لگے "میاں خدا اسے زندہ رکھے۔ مگر یہ قریب المرگ کیا ترکیب ہوئی۔ قریب عربی، مرگ فارسی اور پھر یہ الف لام کا پیوند کیا مطلب؟" میں نے کہا "پھر تو لب سڑک بھی غلط ہوا۔" کہنے لگے "بالکل"۔ میں نے کہا "اور یہ جو فوق البھڑک لکھتے ہیں؟" فرمایا "لاحول ولا قوۃ الا باللہ"۔

ایک دن کسی نے "متلاشی" کا لفظ "تلاش کرنے والے" کے لیے استعمال کیا۔ مولانا نے کہا کہ "لفظ تو آپ کا صحیح ہے مگر اس کے معنی جو آپ نے بتائے وہ صحیح نہیں ہیں۔ متلاشی کے معنی ہیں پریشان یا ضائع شدہ۔ اور اردو میں زبردستی یا ناواقفیت کی بنا پر تلاش کرنے والے کے معنوں میں بولنے لگے ہیں جو محض ایک من گھڑت لغت ہے۔"

ایک دن کسی نے پوچھا کہ "مولانا دعوتوں کے موقعے پر یہ جو کہتے ہیں کہ فلاں گھرانے کی سواریاں آئی ہیں یا سواریاں اتر رہی ہیں، کیا یہ محاورہ صحیح ہے؟" کہنے لگے "بھئی محاورہ تو صحیح ہے مگر ہے زبردستی کی بات۔ اس بدتمیزی پر ہی اتر آؤ تو اپنی بیوی کے لیے بے شک یہ لفظ کہہ لو مگر دوسری عورتوں پر تمہارا کیا حق ہے؟"

مولانا بلا کے نکتہ آفریں تھے۔ بات میں بات پیدا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس کے اعزاز میں ایک تقریب تھی۔ ایک پروفیسر نے ڈاکٹر لوکس کی تعلیمی خدمات کی بڑی تعریف کی۔ مولانا بھی موجود تھے، فوراً بول اٹھے کہ "لوکس صاحب تعلیمی کام کیوں نہ کریں، تعلیم تو خود ان کے نام میں موجود ہے۔" لوگوں نے پوچھا "وہ کیوں کر؟" کہنے لگے "لوکس کو الٹا پڑھو سکول بنتا ہے یا نہیں؟" ڈاکٹر لوکس پاس ہی بیٹھے تھے۔ اردو جانتے تھے، سنتے ہی اچھل پڑے اور مسز لوکس کو جو اس موقعے پر ان کے ہمراہ تھیں، خاص طور پر یہ نکتہ سمجھایا۔

اردو شاعری پر ان کی نظر بڑی وسیع تھی۔ دکن کے ابتدائی شعرا سے لے کر لکھنؤ کے آخری سخنوروں تک کوئی شاعر ہی ایسا ہوگا جس کا کلام ان کی نظر سے اوجھل رہا ہو۔ صاحب کمال

کوئی بھی ہو، یہ ہر ایک کے قدردان تھے۔ میر، غالب، آتش، ناسخ، انیس اور دبیر کی شاعری کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ہم، جان صاحب، چرکیں، جعفر زٹل اور دلمیر جیسے خاص الخاص صاحب مقام حضرات سے بھی مولانا ہی کی وساطت سے متعارف ہوئے۔ چرکیں اور جعفر زٹل کے اشعار وہ سنتے سنانے کے قابل نہ تھے۔ کبھی سناتے بھی تھے تو وہی ایک آدھ شعر جو تھوڑی بہت کوشش کے بعد چھاپا جا سکے۔ البتہ جان صاحب انھیں بہت پسند تھے۔ ایک دن اس شعر کی مضمون آفرینی کی بہت تعریف کی کہ:

سوکن نے میری جامہ پہنا ہے گلبدن کا　　پھولوں میں تل رہا ہے کانٹا مرے چمن کا

اور جان صاحب کی وہ پھبتی بھی انھیں پسند تھی جو انھوں نے داغ پر اس وقت کہی تھی جب وہ رامپور میں داروغۂ اصطبل کے عہدے پر سرفراز ہوئے:

چل کے دلی سے آیا اک مشکی　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

ان کا ذوق پرانے شعرا تک محدود نہ تھا۔ اپنے معاصرین کے کلام پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اقبال کے بڑے مداح تھے۔ ایک دن مس نذر الباقر کا جو بعد میں بیگم نذر سجاد حیدر بنیں، ابتدائی زمانے کا ایک شعر سنایا۔ اور اس کی سادگی اور مضمون کی سچائی کو بہت سراہا:

حسن صورت چند روزہ حسن سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں اس سے خوش ہوتا ہے دل

اردو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ فارسی میں بھی وہ اہل زبان سے پیچھے نہیں تھے۔ نئی فارسی کے نئے الفاظ اور نئے محاوروں سے انھیں پوری واقفیت تھی۔ اور عربی کے تو بادشاہ تھے۔ صرف و نحو اور معنی و بیان پر خاص توجہ تھی۔ اور عروض پر تو حرف آخر تھے۔ پڑھاتے وقت سبق کی عبارت اور اس کے معنی کچھ اس طرح سے ذہن نشین کرا دیتے تھے کہ اس کے بعد نہ متن کے الفاظ کبھی بھول سکتے نہ ان کی تشریح۔ آج بھی ان کتابوں کی عبارتوں کی عبارتیں ازبر ہیں جو آج سے پینتیس چالیس سال پہلے ان سے پڑھی تھیں۔ بی۔ اے کے کورس میں ہم مقاماتِ ہمذانی

پڑھتے تھے۔ ان کا فرضی ہیرو ابوالفتح اسکندری نام ایک آوارہ گرد گپ باز ہے۔ ایک مسجد میں امام کو نماز لمبی کرتے ہوئے دیکھ کر کہتا ہے " ان الامام لقد قام کانہ نام" یعنی امام قیام میں ایسا جم کر کھڑا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سو گیا ہے۔ یہ فقرہ مولانا نے آہستہ آہستہ کچھ اس انداز سے کہا کہ فی الفور دل پر نقش ہو گیا۔ آج بھی کوئی امام قیام کو طول دیتا ہے تو خدا معاف کرے مجھے سورۂ فاتحہ کی بجائے ابوالفتح اسکندری کا یہی فقرہ یاد آتا ہے۔ اسی طرح مقامات میں یہ دو شعر آئے:

ویحک ان الزمان زور   فلا یغرنک الغرور

لاتلتزم حالۃً ولکن   دربالیالی کما تدور

افسوس ہے یہ زمانہ ایک دھوکا ہے۔ اس سے دھوکا نہ کھا اور ایک حالت پر ہرگز قائم نہ رہ۔ جیسے زمانہ بدلتا جائے تو بھی اس کے ساتھ بدلتا جا۔

ان اشعار کی تہہ میں جو ابن الوقتی فلسفہ ہے، مولانا جیسے اصول پرست انسان کو اس سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ مگر ان کے پڑھانے کے انداز کو کیا کہیے کہ جونہی انھوں نے یہ شعر پڑھے، ہمیں حفظ ہو گئے۔ ایسی ایسی دسیوں بیسیوں مثالیں ہیں، کوئی کہاں تک بیان کرے۔

ایک دن کسی نے سوال کیا کہ مولانا یہ جو سورۂ فاتحہ کے آخر میں " ولا الضالین" کو لوگ " ولاالدالین" کہتے ہیں، کہاں تک صحیح ہے۔ کیا 'ض' اور 'د' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مولانا نے اس کے جواب میں پہلے تو زبان کی نوک کو ڈاڑھ کی جڑ میں لگا کر 'ض' کا صحیح تلفظ واضح کیا۔ پھر کہنے لگے کہ " صوتیات سے الگ ہو کر بھی دیکھو تو آخر کہاں تک " ض" کا " د" بناتے رہو گے۔ فرض کرو کہ ایک عربی کے عالم کی اہلیۂ محترمہ علیل ہیں۔ اور وہ طبیب کے پاس نسخہ لینے کے لیے تشریف لے جاتے ہیں، تو کیا وہ یہ کہنا پسند فرمائیں گے کہ دیکھیے حکیم صاحب میری بیوی کو فلاں " مرد" لاحق ہو گیا ہے، کیوں؟"

میں اپنے استاد کی باتیں کہاں تک بیان کروں۔ ان کی یہ ایک بات ہی کیا کم ہے کہ میں کم و بیش پانچ سال تک ان کی خدمت میں حاضر رہا اور اس سارے عرصے میں کبھی ایک لمحہ بھی ایسا نہ آیا کہ میں نے ان کے مزاج میں خفگی یا طبیعت میں تکدر دیکھا ہو۔ جب بھی دیکھا انھیں مسکراتے ہی دیکھا۔ ان کے مزاج کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف تو وہ متانت اور سنجیدگی کے پتلے تھے اور دوسری طرف ان کی طبیعت کی شگفتگی تھی جو ایک چڑھے ہوئے دریا کی طرح اپنے کناروں سے دست و گریباں نظر آتی تھی۔ وہ وضع کے اتنے پابند تھے کہ ہمیشہ اچکن اور اچکن کے ساتھ ایک گول سی ٹوپی پہنا کیے۔ پاجامہ ہمیشہ علی گڑھ کی طرز کا ہوتا تھا۔ البتہ پاؤں میں براؤن رنگ کا بوٹ پہن لیتے تھے۔ گویا اس حد تک نئے فیشن سے صلح کر لی تھی۔ انھیں ہلکا سبز رنگ پسند تھا۔ اچکن اور ٹوپی دونوں اکثر اسی رنگ کی ہوتی تھیں لاہور کی شدید سے شدید گرمی میں بھی ہم نے نہ کبھی ان کی اچکن کا کالر کھلا دیکھا نہ کوئی بٹن۔ نہ کبھی سر سے ٹوپی اتری نہ کبھی بوٹ کا تسمہ ڈھیلا ہوا۔ باتیں کرتے تھے تو نپے تلے انداز میں آہستہ آہستہ بولتے تھے اور گاہے گاہے رک رک کر۔ رہی ان کی مسکراہٹ تو وہ ہر حال میں ان کے ساتھ تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ ان کے ہونٹوں سے بڑھ کر ان کے سرخ و سفید چہرے پر مسلط ہو چکی تھی۔ ہنستے بھی تھے مگر کم۔ البتہ ان کی مسکراہٹ ان کی شخصیت کا مستقل جزو تھی۔ ہونٹ نہ بھی مسکرائیں تو چہرہ ضرور مسکراتا تھا۔

ہمارے مولانا پیسہ والے تھے نہ پیسے کی خواہش رکھتے تھے۔ نہ مشہور تھے نہ شہرت چاہتے تھے۔ ان کی زندگی، شادی غمی ہر طرح کے واقعات سے پُر تھی۔ مصائب نے بال بھی قبل از وقت سفید کر دیے تھے۔ خضاب کرتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔ ضبط کا وہ عالم تھا کہ اپنی تکلیف کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کسی کو برا کہتے نہیں سنا:

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا　　دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

میں نے عربی میں ایک سے ایک بڑھ کر استاد پائے ہیں۔ مولوی عبدالکریم مرحوم و مغفور کی یہ کیفیت تھی کہ میں نے چھٹی جماعت میں ان سے نواب صدیق حسن خاں کے عربی قصائد پڑھے ہیں جن کا سکول تو کیا کالج کے کورس سے بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کے بعد میں نے گوجرانوالہ میں مولوی محمد شریف صاحب سے عربی پڑھی۔ بڑے لائق تھے اور بڑے انہماک سے پڑھاتے تھے۔ ان کے بعد مولوی عبدالغنی تھے جو حضرت سید انور شاہ دیوبندی مرحوم کے شاگرد تھے۔ سید صاحب کی باتیں اکثر سناتے تھے اور اپنے طالب علمی کے زمانے کو بار بار یاد کرتے تھے۔ کالج کا زمانہ آیا تو میں نے سب سے پہلے دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں شمس العلما مولانا عبدالرحمٰن دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ بڑی محبت اور شفقت سے پڑھاتے تھے۔ اردو بڑی چست بولتے تھے اور کسی غیر اہل زبان کو تھوڑا بہت بھی سنتے تو بڑے خوش ہوتے اور اس کی ہمت بندھاتے۔ مجھ پر خاص عنایت تھی۔ دہلی میں میرا قیام مختصر رہا اور ایک سال سے کچھ پہلے ہی میں لاہور کے مشن کالج میں منتقل ہو گیا۔ یہاں مولانا ادیب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی میسر ہوئی اور سچ پوچھیے تو میری عربی، فارسی، اردو کی اصل تعلیم ان ہی کے قدموں میں ہوئی۔ یہ ان ہی کا فیضان تھا کہ میں نے کالج کے تیسرے سال کوئی تیاری کیے بغیر فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور دوسرے نمبر پر پاس ہوا۔ اور دو سال بعد اسی طرح اردو کا ادیب فاضل بھی بن گیا۔ اب بھی مجھے ان زبانوں سے شوق ہے تو یہ محض میرے استاد کا عطیہ ہے، میرا اس میں کوئی کمال نہیں۔ میں نے عربی کو اب تک اپنے طور پر جاری رکھنے کی کوشش کی ہے تو اس لیے کہ قیامت کے دن اپنے مولانا سے کہہ سکوں کہ دیکھیے حضرت آپ نے جو کچھ پڑھایا تھا، وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔

مولانا اپنے شاگردوں کا کوئی اچھا کام دیکھتے یا ان کی کامیابی کی خبر سنتے تو بے حد خوش ہوتے مجھے یاد ہے کہ جب میں بی اے کے امتحان میں کامیاب ہوا اور فلسفے میں وظیفہ اور عربی میں سونے کا تمغہ حاصل کیا تو وہ کس قدر مسرور تھے اور کیسے ہر ملنے والے کو یہ خوش خبری سناتے تھے

اور کالج کے ایک امتحان کے موقعے پر میرے اردو کے پرچے سے کتنے خوش ہوئے تھے، کتنے فخر سے وہ سارا پرچہ کلاس میں پڑھ کر سنایا تھا، اور کس فراخ دلی سے پچاس میں سے انچاس نمبر دیے تھے۔ یہی میری سب سے بڑی سند ہے۔ اردو ہماری قومی زبان تو ہے ہی، مگر مجھے اس لیے بھی عزیز ہے کہ یہ میرے استاد کی زبان ہے۔

میں نے مولانا سے بی۔ اے تک عربی پڑھی۔ ایم۔ اے میں انگریزی میں داخلہ لے لیا۔ مگر ان سے رابطہ وہی قائم رہا جو پہلے تھا۔ اتنے میں مولانا بیمار ہو گئے۔ ایک سال پہلے جب وہ وطن تشریف لے گئے تھے تو ان پر پلیگ کا حملہ ہوا تھا۔ اس موقعے پر انھوں نے خود ہی اپنا علاج کیا اور بظاہر اچھے بھی ہو گئے، مگر نقاہت باقی رہی۔ کالج میں واپس تشریف لائے تو لوگوں سے اپنے مرض کا مذاقاً ذکر کیا۔ "دیکھیے اب کے ہمیں پلیگ ہو گیا، بھلا یہ بھی کوئی ہونے کی چیز تھی۔" ایک ماہر طب کی زبان سے یہ سن کر ہم بھی ہنس پڑے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بدبخت مرض جاتے جاتے بھی ایک مہلک وار کر جائے گا۔ ایک تو کمزوری کا عالم، اس پر شبانہ روز پڑھنے پڑھانے کے مشاغل۔ مولانا کی طبیعت پر بوجھ پڑا اور پھیپھڑوں کو تپ دق نے آلیا۔ اول اول تو انھوں نے پروا نہ کی۔ مگر آخر کو صاحب فراش ہو گئے۔ کالج کی طرف سے علاج کی جو کوشش ہو سکتی تھی کی گئی، مگر افاقہ نہ ہوا، اور ہوتا بھی کیسے، جس کا جانا مقدر ہو چکا ہو، اسے کون روک سکتا ہے؟ ہم لوگ دوائیں دیتے اور دعائیں مانگتے رہے مگر نہ دوا کا اثر ہوا نہ دعا کا۔ آخر ۲۲ اپریل ۱۹۲۸ء کا نہ بھولنے والا دن آن پہنچا جب مولانا اپنے بچوں، عزیزوں دوستوں اور شاگردوں کو اکیلا چھوڑ کر تن تنہا ایک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں آتا۔ ان دنوں میں ان ہی کی سفارش پر ان کی جگہ جز وقتی طور پر کام کر رہا تھا۔ ایک دن پہلے میو ہسپتال میں زیارت کو گیا۔ ان کی بیماری کے دوران میں نے خدمت کے لیے ایک نوکر کا انتظام کر دیا تھا۔ انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہ سکے۔ میں بھی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ان کی آنکھوں میں آنسو جھلکتے دیکھ کر الفاظ

حلق میں رک گئے۔ ہسپتال کے پلنگ پر پڑے ہوئے وہ مجھے بڑے ہی نحیف نظر آئے۔ پائنتی کی طرف ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادی برقعے اوڑھے ہوئے ایک بے کسی کے عالم میں بیٹھی تھیں۔ میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ جوں کا توں کر کے دل کو تھاما، سلام کیا اور چلا آیا۔ دوسرے دن کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، واپس آیا تو مولانا کے انتقال کی خبر ملی۔ ان کا مکان مزنگ میں تھا۔ بھاگ کر وہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ جنازہ کبھی کا جا چکا ہے۔ قبرستان پہنچا تو اس غریب الدیار کو سپرد خاک کیا جا چکا تھا۔ مغرب کا وقت تھا اور آفتاب کے ساتھ وہ آفتاب علم بھی غروب ہو چکا تھا جس کی روشنی سے ہماری دنیا روشن تھی۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور گھر واپس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرا دل ڈانواں ڈول تھا۔ یہ تھا آخری منظر ایک ایسے شخص کی زندگی کا جو پاکیزگی اور مروت کا پتلا تھا، جس کا دل محبت کی گرمی سے گرم اور سینہ علم کے نور سے منور تھا، جس کی زندگی نوع انسان کی ایک مسلسل خدمت تھی، جس کو مصیبتوں نے گھیرے رکھا مگر کسی نے کبھی اس کی زبان سے گلہ سنا نہ شکوہ۔ دل میں ہمیشہ وہی صبر و شکر اور لب پر وہی ایک مستقل تبسم۔ جس نے زمانے کا ظلم و ستم ایسی خوشی سے قبول کیا جیسے اس کا حق اس کو پہنچ رہا ہو اور شاید مظلومیت اولاد رسولؐ کا حق بھی ہے۔

آج میرے غریب الوطن استاد کی قبر کا نشان بھی باقی نہیں ہے۔ میکلوڈ روڈ جاتا ہوں تو سارے قبرستان پر فاتحہ پڑھ کر چلا آتا ہوں۔ دل کو دکھ ہوتا ہے تو استاد کی آواز سنائی دیتی ہے "غم نہ کر، میں نے زندگی میں کب نام و نشان چاہا تھا جو مرنے کے بعد اس کی آرزو کروں:

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مقام ماست "